فیاض خاں اسے دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ اس نے اس کے چہرے پہ کسی گہرے دکھ کی علامت ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی اور آخر اپنی ناکامی پہ جھلا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے خاموشی سے چائے کے پیسے ادا کئے اور دوکان سے باہر نکل آیا۔ اس نے پھر لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کر دیئے۔ بلکہ شاید اب اس کی رفتار زیادہ تیز ہوگئی تھی۔ اسے تو جتنا غصہ آتا تھا' یہ واقعی ایک سوال ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا ایک گلی سے دوسری گلی میں اور دوسری گلی سے تیسری گلی میں وہ یوں داخل ہو رہا تھا۔ گویا بہت جلد اسے کہیں پہنچنا ہے۔ مگر اسے پہنچنا کہاں تھا؟ ایک بوڑھے کباب فروش کو دیکھ کر وہ ٹھٹھکا۔ کباب فروش نے فٹ پاتھ پر بجلی کے کھمبے کے برابر اپنی دوکان جمائی تھی۔ کھمبے پر ایک پٹھے کا ٹکڑا لٹکا دیا گیا تھا۔ جس پہ کالی روشنائی سے لکھا ہوا تھا۔ ''دلی کباب والا۔'' فیاض خاں فٹ پاتھ پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ ''لاؤ۔ بڑے میاں! کباب کھلاؤ۔''

کباب کھاتے کھاتے فیاض خاں نے پوچھا۔ ''کہو بڑے میاں فساد کے دنوں میں آئے تھے؟''

''ہاں میاں۔'' کباب فروش متاسفانہ لہجہ میں بولا۔ ''ساری دلی میں آگ لگ رہی تھی اپنی بھری دوکان چھوڑ کے آیا ہوں۔ سامنے سیخیں رکھی تھیں۔ بس انہیں بغل میں مارا اور نکل پڑا۔'' کباب فروش آگ جھکنے لگا۔ پھر آپ ہی آپ کہنے لگا۔ ''میاں بہت بڑی دوکان تھی میری۔ یہاں کیا ہے سڑک پہ بیٹھا ہوں۔''

فیاض خاں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''لو بڑے میاں اپنے پیسے۔'' اور آگے چل پڑا پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ ہر ڈگ کے بعد اس کی رفتار زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ وہ کس سڑک پر سے گزر رہا تھا۔ اس کا شاید اسے احساس نہیں تھا۔ ایسا عالم میں اکثر وہ سڑکوں اور گلیوں کے احساس سے بری ہو جاتا تھا۔ دوکانیں اور دوکانوں کے بڑے بڑے بورڈ سامنے آئے اور گزر گئے تانگوں' سائیکلوں اور موٹروں کے شور میں وہ اپنے آپ کو گم ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ایک رواں دواں ہجوم تھا اور اس ہجوم میں ہو بہا چلا جا رہا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ یہ ہجوم بڑھتا چلا جائے اور پھر بے تحاشا وہ دوڑنا شروع کر دے پھر اتنا شور ہو کہ کانوں کے پردے پھٹ جائیں اور اس رستا خیز میں وہ گم ہو جائے کھو جائے۔ اس نے کئی ایک مرتبہ غیر واضح طور پر یہ خواہش بھی محسوس کی کہ ایکا ایکی زمین اس زور سے ہلے کہ یہ ساری بلند و بالا عمارتیں اڑا اڑا دھم کر کے نیچے آ گریں اور ساری چیزیں اوندھی ہو جائیں اس نے اور برق رفتاری سے چلنا شروع کر دیا۔ کئی ایک شخصوں سے اس کی نادانستہ طور پر ٹکر ہوئی۔ ایک دو آدمیوں کو اس نے جان بوجھ کر کندھا مارا۔ اس نے یہ دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ اس کی اس روش کا ان پہ کیا ردعمل ہوا۔ ادھر ادھر دیکھے بغیر وہ آگے بڑھے چلا گیا۔ پھر اچانک اس نے اپنے آپ کو ایک مختلف فضا میں پایا۔ یہاں نہ تانگوں اور موٹروں کا شور تھا نہ راہگیروں کا ہجوم تھا۔ اکا دکا راہگیر ایک فراغت کے احساس کے ساتھ چلتے

پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی سائیکل سوار آہستہ آہستہ سائیکل چلاتا نظر آتا اور اطمینان سے گزارا چلا جاتا۔ ایک دوکان پر پٹھے کا ترشا ہوا ایک قد آدم بابو کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جس کے پتلون اور کوٹ کا ایک ایک گوشہ پوری نفاست سے دکھایا گیا تھا اس کے نیچے لکھا تھا۔ ''اپنا سوٹ یہاں سلوایئے'' چند قدم کے فاصلہ پر ایک پنواڑی کی دوکان نظر آئی جس پر چند آدمی بیٹھے باتیں گھوٹ رہے تھے۔ پنواڑی کی دوکان دیکھ کر اس نے سگرٹ کی طلب محسوس کی۔ اس نے بڑھ کر سگرٹ کا پیکٹ مانگا۔ دوکان کے پتھر پہ ایک شخص بیٹھا کہہ رہا تھا۔ ''اماں مجھے تو پہلے ہی پتہ چل گیا تھا کہ حملہ ہونے والا ہے۔ سامان باندھ بوندھ گھر والوں کو لے نکل پڑا۔ بس میاں یہ سمجھ لو کہ اس نے بڑی خیریت کی۔ ادھر میں سٹیشن پہنچا اور ادھر واں حملہ ہو گیا۔'' فیاض خاں نے اسے گھور کے دیکھا اور پھر سگرٹ کے پیسے ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ اس خاموش اور پرسکون گلی میں اس نے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کیا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ کسی ایسی سڑک پہ جا پہنچے۔ جہاں کھوئے سے کھوا چھلتا ہوا اور تانگوں' موٹروں اور سائیکلوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ وہ پھر برق رفتاری سے چلنے لگا۔ گلی کے نکڑ پر ایک مزدور سے اس کی بری طرح ٹکر ہوئی۔ مزدور نے تڑخ کر کہا۔ ''میاں سامنے دیکھ کر چلا کرو۔'' اس نے اس بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ اور اپنی رفتار میں کسی قسم کی تبدیلی کئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ مختلف پتلی پتلی گلیوں اور پر ہجوم سڑکوں کو عبور کرنے کے بعد اس نے اپنے آپ کو ایک وسیع اور طویل سڑک پر مڑتے ہوئے محسوس کیا۔ یہاں نہ سواریوں کا شور وغل تھا۔ نہ دوکانوں کی دورویہ قطاریں تھیں۔ گھنے سایہ دار درخت دور تک دورویہ صفیں باندھے کھڑے تھے۔ کبھی کبھی کوئی بس گزری چلی جاتی اور اس کے گزر جانے کے بعد پھر خاموشی پھیل جاتی۔ یہ درخت کچھ یوں کہتے نظر آتے تھے کہ یہ لمحہ بھر کا شور کیا حقیقت رکھتا ہے۔ ہم نے بڑے بڑے ہنگامے دیکھے ہیں۔ ہر ہنگامہ بال آخر ایک جاوداں سکوت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ فیاض خاں بدستور لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔ اب اسے اپنے قدموں کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی اور اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز بھی۔ راوی کے پل پر پہنچ کر وہ ٹھٹھکا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ پل پر کھڑے ہو کر دریا میں چھلانگ لگا دے۔ مگر یہ خیال جلد ہی زائل ہو گیا۔ اسے اس بات سے جھنجھلاہٹ ہونے لگی کہ یہ دریا اتنی سست روی سے کیوں بہہ رہا ہے اس میں ایک امنگ پیدا ہوئی کہ دریا کی لہریں بلند ہوتی چلی جائیں اور سمندروں کے شور کے ساتھ پل کے اوپر سے بہنے لگیں اور پھر منہدم ہو کر پانی میں بیٹھ جائے۔ پھر خود بخود اس کے قدم اٹھ گئے اور وہ آگے بڑھ گیا۔ درختوں کے سائے اب کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔ اس پر فضا سڑک پہ سے گزرتا ہوا وہ بال آخر مقبرہ جہانگیر میں جا پہنچا۔ آم کے ایک درخت کے نیچے ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پہ وہ تھک کر لیٹ گیا۔ یہاں لیٹ کر اس نے پہلی مرتبہ واضح انداز میں سوچا کہ آخر لوگ افسوس کرنے کی باتوں پر افسوس کیوں نہیں کرتے۔ پھر وہ

تنفر آمیز لہجہ میں بڑبڑایا۔ ''شہر تباہ ہو گئے اچھا ہوا۔'' اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

وہ رات فیاض خاں نے مقبرہ جہانگیر ہی میں گزاری۔

ان دنوں فیاض خاں کی اکثر راتیں کھلی فضا میں بسر ہوئیں۔ مزمل نے سر سے سینہ پٹخا کہ میرے گھر رہو۔ مگر فیاض خاں جب ایک مرتبہ انکار کر دیتا تھا تو پھر وہ انکار اقرار میں نہیں بدلتا تھا۔ چنانچہ اس کی نہیں' نہیں ہی رہی۔ مزمل کے سارے دلائل اور ساری التجاؤں کا جواب اب بس اس نے ایک ہی دیا ''نہیں'' اس کے پاؤں میں چکر تھا۔ یا کوئی ایسی چیز تھی۔ جو اسے قرار لینے نہیں دیتی تھی' کسی جگہ ٹکنے نہیں دیتی تھی۔ ہر فضا اور ہر ماحول میں اسے خفقان ہوتا اور وہ بے تابانہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتا۔ کبھی وہ شہر کے ہنگامہ خیز اور پر ہجوم بازاروں میں گھومتا نظر آیا۔ کبھی شہر سے باہر کی خاموش سڑکوں پہ زمین کا گربنا دکھائی دیا۔ اکثر وہ مہاجروں کے کیمپوں کے چکر کاٹتا بھی دیکھا گیا تھا۔ مہاجروں میں وہ ایک خاص قسم کا ردعمل دیکھنا چاہتا تھا اور جب یہ ردعمل اسے نظر نہ آیا تو اسے مہاجروں پر جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ پھر اس نے مقامی لوگوں میں ایک مخصوص قسم کے ردعمل کی جستجو کی۔ یہاں بھی اسے ناکامی ہوئی اس کے مزاج کا پارہ اور چڑھ گیا۔ اس کے لہجہ میں کچھ اور تلخی پیدا ہو گئی اور اس کی حرکات وسکنات میں ایسی تندی اور شدت پیدا ہو گئی۔ جو عام طور پر انتہائی مایوسی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

مزمل نے اس کے ساتھ نتھی ہونے کی بہت کوشش کی۔ لیکن اس نے ہر موقعہ پر اور ہر قدم پر اس کی حوصلہ شکنی کی۔ کبھی کہتا۔ ''میاں میں کھو تو نہیں جاؤں گا اور کھو جاؤں۔ تو ڈھنڈورا پٹوا دینا۔'' مگر مزمل خاصا مستقل مزاج نکلا۔ وہ اس قسم کے سارے فقرے ساری جھڑکیاں پی پی گیا۔ لیکن وہ کیسے کر سکتا تھا کہ چوبیسوں گھنٹے اسے آنکھوں سے اوجھل ہی نہ ہونے دے۔ مزمل کی نگاہ جب بھی چوکی اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لیے جب بھی وہ اس سے جدا ہوا فیاض خاں ایسا غائب ہوا کہ تین تین چار چار دن تک اس کا پتہ نہیں چلا۔ گھومتا گھامتا وہ خود ہی کسی روز اچانک سبطین کے گھر آن ٹپکتا۔ یوں رفتہ رفتہ سبطین کا گھر اس کی مستقل قیام گاہ بن گیا۔ دراصل اسے مزمل سے زیادہ سبطین سمجھتا تھا۔ اس نے نہ تو اس کے ساتھ لگنے کی کوشش کی اور نہ گھر پہ ٹھہرنے کی دعوت دی۔ اخبار کی تجویز کا اس نے اس سے ضرور ذکر کیا۔ سو اس کی اس نے بڑی شدومد سے مخالفت کی۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ اخبار نہیں چلے گا۔

سبطین نے تاؤ میں آ کر کہا۔ ''چلنے نہ چلنے کا ذکر کیوں کرتے ہو۔ ہم پرچون کی دوکان نہیں کھول رہے ہیں۔ اس کا مقصد تو قوم کے ضمیر کو بیدار کرنا ہے۔''

فیاض خاں تڑخ کر بولا۔ ''قوم کا ضمیر ہے کہاں۔ بیدار کسے کرو گے؟''

فیاض خاں کی مخالفت پہ کوئی دھیان نہیں دیا گیا۔ سبطین اور مزمل دونوں قوم سے بہت پر امید تھے۔ سبطین کے گرداب پھر حوائین کا گروہ جمع ہوتا جا رہا تھا۔ مزمل کے ساتھ لاہور کے ایک اور جوشیلے طالب علم اجمل نے سبطین کے یہاں آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ جب اخبار کی تجویز نے زیادہ زور پکڑا تو یہ دونوں منچلے سبطین کی بیٹھک ہی میں آ پڑے۔ مزمل کو دعا دیجئے کہ اس نے ایک اچھے خاصے بڑے مکان کا قبضہ سبطین کو دلا دیا تھا۔ سبطین نے اخبار کی جو سکیم سب سے پہلے تیار کی۔ وہ بڑی جامع تھی۔ مگر اس میں روپے پیسے کا ذکر فکر کہیں نہیں تھا۔ یہ بات اسے حق صاحب کے یاد دلانے پہ یاد آئی۔ یہ مشورہ بھی حق صاحب ہی کا تھا۔ کہ چندے کے لیے ایرا غیرا کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں ہے شہر کے چند ایک رئیسوں سے مل لیجئے وہ ضرور مدد کریں گے۔ آخر یہ فرض حق صاحب ہی نے ادا کیا کہ وہ سبطین کو مختلف رئیسوں سے ملانے کے لیے لے گئے۔ جن سے بقول ان کے ان کی گاڑی چھنتی تھی۔ اس قسم کی ملاقاتوں کے بعد ہمیشہ یہ دیکھا گیا کہ سبطین پان کی گلوری کلے میں رکھے اکیلا گھر لوٹا۔ مزمل کی باز پرس کا ہمیشہ یہ جواب دیا گیا کہ ''وہ آدمی تو تواضع کے ہیں۔ مگر حق صاحب نے مصلحتاً ہماری تحریک کا ذکر مناسب نہ سمجھا۔ پھر کسی دن جائیں گے۔'' آخر اس توجیہہ سے خود سبطین کو اکتاہٹ ہونے لگی اور اس نے ایک مرتبہ پھر مسلمان رئیسوں کے اخلاقی زوال کو اپنا محبوب موضوع قرار دیا۔ حق صاحب کا بھی اب اس مشغلہ سے دل بھر چکا تھا۔ شاید موضوع کی تبدیلی وہ بھی چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک روز آ کر سبطین کو اطلاع دی کہ ایک پریس کے الاٹمنٹ کا مسئلہ درپیش ہے۔ انہوں نے یہ بھی یقین دلایا تھا کہ الاٹمنٹ افسر میرا ملاقاتی ہے۔ اس خبر سے سوکھے دہانوں میں پانی پڑ گیا۔ سبطین نے ایک مرتبہ پھر پھریری لی اور اللہ کا نام لے کر پریس کے لیے درخواست داغ دی۔ اس کے بعد دوڑ دھوپ شروع ہوئی۔ دفتر کے ہر کلرک کی میز پہ دستک دی گئی اور ہر افسر سے ملاقات کی گئی۔ البتہ اس افسر کا پتہ نہ چلا۔ جس سے حق صاحب کی علیک سلیک تھی۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ حق صاحب اس ساری مہم میں سبطین کے ہمرکاب رہے۔ اس مہم کا خاتمہ بالخیر یوں ہوا کہ وہ پریس ایک مہاجر دھوبی کو الاٹ ہوا۔ سبطین نے جب بہت ہائے توبہ مچائی تو اسے ایک لانڈری الاٹ کر دی گئی۔ سبطین یوں بھی مطمئن تھا کہ اس آمدنی سے اخبار چلایا جا سکتا ہے مگر ایک رنگریز اس کے پیچھے پڑ گیا اور بڑے افسروں تک یہ بات پہنچا دی کہ سبطین کو اس کام سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا اور سبطین نے یہ کمال کیا کہ وقت مقررہ پر لانڈری کا قبضہ لینے نہیں پہنچا۔ یوں آئی چیز اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔

اس ناکامی کے بعد سبطین کے شاگردوں میں حق صاحب کے خلاف ایک عام ردعمل شروع ہو گیا۔ صرف ایک سبطین نے ان کی نیت پر شبہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن نمبردار صاحب اس قسم کی بدنامیوں سے بچے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب انہوں نے

سبطین کے اخبار کے ذوق وشوق اور مسلسل ناکامیوں کو دیکھ کر ایک رجسٹرڈ کمپنی بنانے کی تجویز پیش کی تو کسی طرف سے ان پہ شبہ کا اظہار نہیں کیا گیا۔ نمبردار صاحب کو خود ان معاملات کا تجربہ تھا۔ چنانچہ انہوں نے دو دن میں رجسٹرڈ کمپنی کا سارا خاکہ تیار کر ڈالا۔ اس کے بعد حصے بیچنے کی مہم کا آغاز ہوا۔ نمبردار صاحب نے سبطین کو اطمینان دلایا کہ بہت سے صاحب استطاعت لوگ ان کے جاننے والے ہیں اور وہ ان کے کہنے سننے سے حصے خرید لیں گے اور یہ بات انہوں نے سچ ثابت کر دکھائی کاغذ پہ متعدد نام لکھے گئے۔ اور نمبردار صاحب جس کے پاس پہنچے اس نے حصہ خرید لیا۔ یوں کاغذ پچاس ہزار روپیہ جمع ہو گیا۔ جس سے ایک روزنامہ با آسانی جاری کیا جا سکتا تھا۔ بلکہ ایک کباڑی نے دو سو روپے فوراً ادا بھی کر دیئے۔ ان دو سو روپے کے زور پر دفتر کی سرگرمیاں زور شور سے شروع ہو گئیں۔ سبطین نے اپنے اخبار والے سے کہہ دیا کہ اردو اور انگریزی کے سارے روزانہ اخبار دے جایا کرو۔ چنانچہ روز دس بارہ اخبار آتے۔ سبطین بڑے انہماک سے سارے اخباروں کے اداریئے پڑھتا۔ خاص خاص سطروں پہ سرخ پنسل سے نشان لگاتا اور اہم سیاسی مضامین کے تراشے کاٹ کر رکھتا۔ اخباروں کے باقاعدہ فائل بننے شروع ہو گئے۔ خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تحریک کے پرانے ہمدردوں کو خط ڈالے گئے۔ تحریک کے ہمدرد اہل قلم کو قلم سنبھال لینے کی ہدایت کی گئی۔ سٹیشنری بھی خرید لی گئی۔ بس یہ انتظار تھا کہ باقی رقم وصول ہو تو بڑا سامان منگایا جائے اور باقاعدہ اخبار کے اجرا کا کام شروع کیا جائے۔ دن گزرتے گئے اور دو سو روپے کی گنتی کم ہوتی گئی۔ مزید رقم موصول نہیں ہوئی۔ نمبردار صاحب اور سبطین صبح ہی صبح تقاضے کرنے نکلتے اور شام کو ناکام واپس آ جاتے۔ اجمل اور مزمل یاددہانی کے لیے جاتے اور منہ لٹکائے لوٹتے۔ رفتہ رفتہ دو سو روپے ختم ہو گئے۔ مزید رقم وصول نہیں ہوئی اور ایک دن سبطین نے اپنے اخبار والے سے کہہ دیا کہ ''بھئی کل سے اخبارات مت لانا۔ بس ایک اخبار جو پہلے لایا کرتے تھے ڈال جایا کرو۔''

آخر مزمل اور اجمل نے طے کیا کہ روزنامہ نکالنے کی توفیق تو ہمیں کبھی نہ ہوگی نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچیں گی۔ بہتر یہ ہے کہ بات ہفت روزہ پرچے شروع کی جائے بعد کو اسے ہی روزنامہ بنا لیں گے اور اس کے لیے جتنے سرمائے کی ضرورت ہے۔ وہ با آسانی جمع کیا جا سکتا ہے۔ غرض یوں مزمل اور اجمل نے کمر ہمت باندھی اور طلبا اور چھوٹے موٹے آدمیوں سے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ مزمل اور اجمل نے جس تندہی سے چندہ جمع کیا تھا اس تندہی سے اخبار کا ڈیکلریشن حاصل کیا اور سارے انتظامات درست کئے یہ دونوں شخص دن بھر پریس اور کاتبوں کے گھروں کے چکر لگاتے' ڈاک لاتے اور کاروباری خطوط کا جواب دیتے' ایجنٹوں سے بات چیت کرتے' خریداروں کے سوالات کے جواب دیتے' پرچہ پوسٹ کرتے اور بیٹھک کے نل پر اپنی خاکی قمیضیں دھوتے سبطین

سارے دن لکھتا۔ اڈیٹوریل' مضامین' اڈیٹر کی ڈاک کا کالم' خبروں کی تلخیص' خبروں پر تبصرہ' غرض یہ ہفت روزہ اخبار شروع سے آخر تک سبطین کے قلم کا مرہون منت ہوتا۔ مگر نہ محنت مشقت کام آئی' نہ خلوص سے بات بنی۔ ہر تدبیر الٹی پڑی۔ اخبار کو نہ چلنا تھا نہ چلا۔ چندہ رفتہ رفتہ ختم ہونے لگا اور ایک دن وہ آیا کہ پریس کی اجرت ادا کرنے کی غرض سے مزمل کو اپنے کورس کی ساری کتابیں یکمشت بیچ دینی پڑیں۔ دوسری مرتبہ اس عمل کو اجمل نے دہرایا۔ مگر اخبار کی حالت یوں کب سنبھلتی تھی۔ پرچے بک اسٹال پہ بھیجے جاتے وہاں وہ ہفتوں رکھے رہتے اور آخر خاک میں اٹ کر اپنے اصل مقام پہ واپس آ جاتے۔ کسی خریدار کے پاس پیسے بہت فالتو ہوئے تو اس نے پرچہ خرید لیا ورنہ عام طور پر یہی ہوا کہ دیکھنے والے نے پرچہ اٹھایا۔ الٹا پلٹا اور رکھ دیا۔ حق صاحب نے ایک روز ازراہ ہمدردی یہ بتایا کہ پرچے کی پبلسٹی اچھی ہوئی دوسرے دن سبطین نے ادھار قرض سے اشتہار چھپوائے اور اجمل اور مزمل نے خود جا جا کے اشتہاروں کو لوگوں میں تقسیم کیا اور دیواروں پہ چپکایا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات رہا۔ پھر جب اشتہارات کی کمی کی طرف اشارہ کیا گیا۔ تو مزمل اپنے اثر و رسوخ سے دو ڈھائی اشتہار بھی جھپٹ لایا۔ مگر پرچے کی تقدیر میں تو ڈوبنا لکھا تھا۔ کسی طرح نہ ترا۔ پرچہ کسی طرح نہ ترا اور قوم کا ضمیر کسی صورت بیدار نہ ہوا۔

ایک روز جب فیاض خاں واہی تواہی گھر واپس آیا تو دیکھتا ہے کہ کمرے کی بجلی غائب ہے۔ اس کی بجائے ایک موم بتی جل رہی ہے۔

''کیوں بھئی بجلی کو کیا ہوا؟''

''کٹ گئی۔'' مزمل نے جواب دیا۔

''کیوں؟''

''بل کے تین سو روپے کس گھر سے آتے؟'' سبطین بولا۔

''مگر تمہارا اخبار کا کام کیسے ہوا کرے گا؟''

سبطین حسرت آمیز لہجہ میں بولا۔ ''وہ کام اب ختم ہو گیا۔''

فیاض خاں نے چونکنا مطلق ضروری نہ سمجھا۔ اطمینان سے بولا۔ ''خیر وہ کام تو ختم ہونا ہی تھا۔ مجھے تمہاری فکر ہے۔ تمہارا وقت اب کیسے گزرا کرے گا۔''

اس طنز کا کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ فیاض خاں نے جوتے کے تسمے کھولے اور چادر میں منہ لپیٹ کر خراٹے لینے لگا۔

سبطین کا گھر خاصی سرائے بنا ہوا تھا۔ مردانے کے بڑے کمرے میں سبطین' فیاض خاں' مزمل اور اجمل کے بستر بچھے ہوئے تھے۔ حق صاحب بھی کافی دن تک یہاں جمے رہے۔ حمید ڈاکیہ کو بھی شروع میں یہیں پناہ لینی پڑی تھی۔ رفیا کی کوٹھری میں علن اور کالے خاں نے مستقل طور پر قیام کر رکھا تھا۔ علن کو کوئی دوکان الاٹ نہ ہو سکی۔ لیکن لاہور میں مویشی بے تحاشا ذبح ہو رہے تھے۔ علن نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے اور سیخ کے کباب بنانے شروع کر دیئے۔ زنانے میں بوجی کے کمرے میں افسری نے بھی قیام کر رکھا تھا۔ ایک دوسرا چھوٹا سا کمرہ اور تھا۔ جس میں بلو اور نوابن نے بستر بچھا لیے۔ کوٹھری میں بوجی نے اپنا سامان بھر دیا تھا۔ اس لیے گلشن کو بھی اسی کمرے میں بسیرا کرنا پڑا۔ اسی کمرے میں بلو کے بچہ ہوا اور اسی کمرے میں نوابن کے طوطے نے انتقال کیا۔ نوابن کی یہ بڑی خواہش تھی کہ اس کے طوطے کی قبر کسی نیم کے درخت کے نیچے بنے لیکن جب اڑوس پڑوس میں کہیں نیم نظر نہ آیا تو اس نے صحن کے ایک کونے میں اسے داب دیا۔ بوجی کا کمرہ مردانے کے بالکل برابر تھا۔ افسری کے رنگ ڈھنگ کا انہیں پتہ ہی نہیں چلا گلشن کا ماتھا ضرور ٹھنکا تھا اور اس نے بوجی سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا۔ مگر بوجی نے تو افسری کو بیٹی بنا لیا تھا۔ وہ اب اس کے خلاف کسی شبہ کو دل میں کیسے جگہ دے سکتی تھیں۔ مردانے میں اور کسی کو تو نہیں مگر فیاض خاں کو ضرور حق صاحب کی حرکات وسکنات پر شبہ گزرا تھا ایک دو مرتبہ اس نے ان پر فقرہ بازی بھی کی۔ لیکن حق صاحب سارے فقرے شربت کے گھونٹ کی طرح پی گئے۔ حق صاحب بھی سمجھتے ہوں گے کہ فیاض خان خوش ہے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ کو گھر آتا ہے۔ اسے جس طرح بھی ہو ٹالتے رہو۔ انہوں نے ہنگامے کا آغاز کرتے وقت بھی یہ دیکھ لیا تھا۔ کہ فیاض خاں گھر میں نہیں ہے سبطین کو ان کی روش بہت گراں گزری مگر وہ جو مثل ہے کہ جب دولہا دلہن راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ افسری میں کچھ ایسی گرمجوشی تو واقعی نہیں تھی مگر اسے انکار بھی نہیں ہوا اور بوجی نے افسری کو واقعی اس شان سے رخصت کیا جیسے بیٹی رخصت کرتے ہیں۔

تیسرے دن جب فیاض خاں گھر میں گھسا تو سبطین نے اسے اطلاع دی کہ حق صاحب کو ایک کارخانہ الاٹ ہو گیا ہے اور وہ یہاں سے منتقل ہو گئے ہیں۔ فیاض خاں نے بڑی بے تکلفی سے کہا۔ ''خس کم جہاں پاک'' مگر جب اسے یہ بتایا گیا کہ افسری بھیاس کے ساتھ گئی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ فیاض خاں اپنے بوٹ کے تسمے کھول رہا تھا۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔ اک ذرا سکتہ کے بعد اس نے تسمے پھر کس لیے اور بغیر کچھ کہے سنے باہر نکل گیا۔

فیاض خاں نے وہ رات سڑکوں پہ گھوم کر گزاری۔

افسری کے نکاح کے واقعہ پر بڑی چہ میگوئیاں ہوئیں۔ نکاح اچانک ہوا۔ کسی کو سان گمان بھی نہ تھا کہ افسری حق صاحب سے بھی

بیاہی جاسکتی ہے۔ اس میں ان بیبیوں کی واقعی بڑی کرکری ہوئی۔ جو اڑتی چڑیا کو پکڑتی ہیں اور جن کے کان پتے کے کھڑکنے پہ کھڑے ہوجاتے ہیں۔ انہیں اس واقعہ کی ہوا بھی نہیں لگی۔ سب کو عین وقت پر پتہ چلا۔ شاید اس ناکامی کے احساس نے اس واقعہ کو اور اہمیت دے دی۔ بلو کو اس واقعہ کے بعد ریل گاڑی کے بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات یاد آئے۔ ان کی معنویت اس پہ اب روشن ہوئی اور اس نے ہر واقعہ کو بار بار ساری تفصیلات کے ساتھ سنایا۔ لیکن نمبردارنی اس واقعہ کی ابتدا ہجرت سے بہت پہلے سے بتاتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ رشید کی زندگی میں ہی افسری اور حق صاحب میں آشنائی ہوچکی تھی۔ نوابن نے نمبردارنی کے اس خیال کی ہر موقعہ پر تائید کی اور اس کے ثبوت میں رشید اور افسری کی مسلسل ان بن کا ذکر بھی بار بار کیا۔ نمبردارنی نے یہ بات نمبردار کے حوالہ سے کہی کے حق صاحب ہر وقت سبطین کی بیٹھک میں پڑے رہتے تھے اور اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ افسری سے تاک جھانک کی جائے۔ انہوں نے رشید کی موت پر اس کے ردعمل کا بھی ذکر نکالا اور کہا۔ ''اری خصم مرا تو وہ ایک دن بھی بیٹھ کے نہ روئی اور کوئی ہوتی تو جیسے اس کا سہاگ لٹا تھا تو وہ تو سر بھی نہ اٹھاتی۔''

نوابن نے اس پہ ٹکڑا لگایا۔ ''اجی اس نے تو خدا کا شکر ادا کیا کہ چلو اچھا ہوا چھٹکارا ملا۔ نابی بی اس مرد سے تو اس کا دل ہی نہ ملا۔''

بلو بولی۔ ''مگر وہ مرد بڑا اجنتی تھا۔ اس نے اس کا ہاتھوں میں دل رکھا اور کوئی ہوتی تو ایسے میاں کے پیر دھو دھو کے پیتی۔''

نمبردارنی کہنے لگیں۔ ''اجی وہ عورتیں اور ہوویں ہیں۔ یہ اچھال چکا تو میاں کو خاطر میں نہ لائی۔ اس کا تو دیدہ پھٹا ہوا تھا۔''

بلو بحث کو سمیٹتے ہوئے بولی۔ ''خیر بی بی وہ غریب تو اپنی جان سے گیا۔ اب یہ کچھ ہی کیا کرے۔''

افسری نے ان باتوں کا مطلق اثر قبول نہیں کیا۔ اس نے نہ تو بیبیوں کی تہمت طرازیوں کا اثر قبول کیا اور نہ حق صاحب کے جوش و خروش کا اثر قبول کیا۔ حق صاحب نے بڑے چاؤ سے یہ بیاہ رچایا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد جن چیزوں نے انہیں قنوطیت سے نجات دلائی۔ ان میں ایک تو کارخانہ تھا اور دوسری افسری تھی۔ یوں پاکستان آتے ہی وہ پھر مسلم لیگی بن گئے تھے۔ مگر انہیں اس بات کی بڑی شکایت تھی کہ جن لوگوں نے پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لیا اور اس کی خاطر اپنا تن من دھن لٹا دیا۔ انہیں اب دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا گیا ہے۔ پاکستان کے سلسلہ میں انہوں نے خود جو جو قربانیاں دی تھیں۔ اس کا بھی انہیں احساس تھا۔ انہوں نے بار بار لوگوں پہ یہ جتایا تھا کہ انتخابات کے سلسلہ میں وہ گاؤں گاؤں مارے پھرے اور حسن پور کے سارے ہندو ان کی جان کے دشمن ہو گئے۔ بلکہ ان کی وکالت بھی اس چکر میں تھپ ہوگئی مگر پاکستان کی دھن میں انہوں نے اپنی جان کو جان نہ سمجھا اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دی۔ اس کے علاوہ انہیں اور بھی چھوٹی چھوٹی شکایتیں تھیں۔ ایک انہیں یہ بھی شکایت تھی کہ پاکستان میں برسات

ڈھنگ سے نہیں ہوتی۔ لیکن جب ایک مرتبہ موسلا دھار بارش ہوئی اور ایک سڑک پہ چلتے چلتے ان کا پاؤں پھسل گیا تو پھر انہیں پاکستان کی سڑکوں سے شکایت پیدا ہوگئی جب انہیں کارخانہ الاٹ ہوگیا تو ان کی یہ ساری شکایتیں رفع ہوگئیں۔ اگرچہ یہ احساس انہیں پھر بھی رہا کہ انہوں نے پاکستان کے لیے جتنی قربانیاں دی تھیں ان کا انہیں قرار واقعی اجر نہیں ملا۔ تھوڑی بہت جو کسر باقی رہ گئی تھی۔ اسے افسری کے نکاح نے رفع کیا۔ اس کے چند دن تک سبطین کی بیٹھک میں ان کی صورت مطلق نظر نہ آئی۔ لیکن جب افسری اپنی بے نیازی پر بدستور ڈٹی رہی اور مختلف موقعوں پر حق صاحب کو بری طرح جھڑکیاں کھانی پڑیں تو انہوں نے رفتہ رفتہ پھر سبطین کے یہاں آنا شروع کر دیا اور ایک مرتبہ پھر انہوں نے سبطین کی ہر تجویز پر بے سوچے سمجھے آمنا وصدقنا کہنے کا شعار اختیار کیا۔

رفتہ رفتہ افسری کی سرد مہری کے قصے عام ہونے شروع ہوئے۔ حق صاحب جو نکاح کے فوراً بعد کے زمانہ میں نقلے تصور کئے گئے تھے یکا یک سب کی ہمدردیوں کے مستحق بن گئے۔ بوجی کی ساری ہمدردیاں پہلے افسری کے ساتھ تھیں۔ مگر چونکہ اب اس نے ان کے یہاں آنا جانا بہت کم کر دیا تھا۔ اس لیے وہ بھی اب اس سے کچھ فرنٹ ہوگئی تھیں۔ اسلیے ان واقعات پر تبصرہ کرنے کے لیے بلو اور نوابن کو نمبردارنی کے گھر جانے کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑی۔ خود جب نمبردارنی وہاں آئیں تو انہوں نے یہ قصہ چھیڑ دیا۔ نوابن نے نمبردارنی کے کان میں خاصی دیر تک باتیں کیں۔ آخر اس نے ذرا آواز بلند کی۔ ''اری میا۔ وہ خصم کو تو منہ ہی نہیں لگاتی۔ بات بات پہ جھڑکیاں دیوے ہے۔''

اب بلو کو بھی بولنے کا حق حاصل ہوگیا۔ ''اجی کیا پوچھو ہو۔ خصم غریب کی تو جان ضیق میں ہے۔ وہ ہاتھ باندھے کھڑا رہوے ہے۔ ''بیگم یہ کھاؤ۔ بیگم یہ لو۔ بیگم یہ کرو۔'' اور بیگم کے ٹھسے میں گرم مصالحہ۔ اس سے بات نہیں کرتی کسی بات پہ اگر وہ بول پڑے ہے تو وہ کتے کی سی ٹانگ لیوے ہے کہ خدا کی پناہ۔''

نمبردارنی بولیں۔ ''بی بی سچ پوچھو تو اس عورت کا دیدہ پھٹ گیا ہے۔ گھر والی عورتوں کے تو اس کے طور ہی نہیں۔''

نوابن نے جو نتیجہ اخذ کیا۔ وہ زیادہ جسارت آمیز تھا۔ ''میا میری یہ بات لکھ لو۔ یہ اس مرد سے لگ کے نہیں بیٹھے گی۔''

اس فقرے نے بوجی کو بہت چونکایا۔ انہوں نے براہ راست افسری کی مذمت مناسب نہ سمجھی۔ صرف اتنا کہا۔ ''توبہ توبہ برا زمانہ آیا ہے۔ ہم نے اپنے زمانے میں ایسی باتیں کاہے کو سنی تھیں۔''

بلو اس پہ چمک کر بولی۔ ''بوجی یہ چودھویں صدی ہے۔ اس زمانے میں جو نہ ہو تھوڑا ہے۔''

بوجی کو زمانہ پہ بہت غصہ آیا۔ ''اس زمانے کا تختہ لوٹے۔ اس میں کیا کیا ہوگا۔ گھر اوجڑ گئے۔ آدمی کٹ مر گئے۔ اس کمبخت کو صبر

ہی نہیں آتا۔"

بوجی کے اس فقرے نے بحث کو دوسری طرف موڑ دیا اور اس لیے گلشن کو اب ان کے پاس بیٹھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ آج کل گلشن پہ افسری کچھ زیادہ ہی مہربان تھی۔ اس لیے گلشن بھی اسے اطلاعات پہنچانے میں بخل نہیں برتتی تھی۔ البتہ فیاض خاں کے متعلق جب بھی افسری نے اس سے کچھ پوچھا تو اس کے کان ضرور کھڑے ہوئے مگر وہ اس پوچھ گچھ کی لم کو اچھی طرح سمجھ نہیں سکی۔

کئی ماہ تک علن کا کوئی ٹھکانا نہ ہو سکا۔ اس کی دوکان کیا چھٹی وہ اچھا خاصا گھن چکر بن گیا۔ اس کے مطالبات کچھ بہت لمبے چوڑے نہیں تھے۔ اسے ایک چھوٹی سی دوکان کی تلاش تھی جہاں وہ تھوڑا بہت سودا خرید کر سجا لے اور اپنی کھوئی ہوئی دوکان کی یاد تازہ کر لے۔ مگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔

وہ خدا سے مانگتا تو شاید کچھ مل بھی جاتا۔ خدا ہمیشہ نہ سہی کبھی کبھی ضرور اپنے بندوں پہ رحم کھا لیتا ہے۔ مگر اس نے محکمہ بحالیات سے دوکان مانگی تھی۔ محکمہ بحالیات والوں کا حال یہ ہو رہا تھا کہ نہ ان کے قہر کا ٹھیک تھانہ مہر کا۔ سخاوت اور بخل دونوں کا انہوں نے وہ اعجاز دکھایا کہ اگلے پچھلے سارے ایکارڈ مات ہو گئے۔ جس پہ مہربان ہوئے اس کا منہ موتیوں سے بھر دیا۔ جنہیں عنایت کا مستحق نہ سمجھا۔ انہوں نے الاٹمنٹ کے دفتروں کی دہلیز کی خاک نہ چھوڑی اور پھر بھی پیاسے ہی لوٹے۔ علن پہ ایک مرتبہ عنایت ہوئی تھی۔ مگر عجب انداز سے۔ اس نے اپنے بارے میں درخواست میں لکھا تو یہی تھا کہ وہ حسن پور میں پنواڑی کی دوکان کرتا تھا۔ الاٹمنٹ والوں نے اس کے حال پہ کمال مہربانی کی کہ ایک انگریزی دواخانہ اس کے نام الاٹ کر دیا۔ اس پہ ایک مہاجر کمپاؤنڈر نے بہت شور مچایا۔ علن بھی اس بے ڈھب عنایت سے کچھ خوش نہ تھا۔ مہاجر کمپاؤنڈر کے شور مچانے پہ محکمہ کی سمجھ مین یہ تو آ گیا کہ انگریزی دواخانہ علن کے نام الاٹ نہیں ہونا چاہیے۔ مگر اس کے بعد وہ اس مہاجر کمپاؤنڈر کو نہیں بلکہ ایک پرچونئے کو الاٹ ہوا۔ بہر حال علن اس جھک جھک سے بچ گیا۔ اس کے بعد اس نے بہت دوڑ دھوپ کی اور ایک ایک کلرک کی ہتھا جوڑی کی۔ مگر پھر اس کی قسمت ٹس سے مس نہ ہوئی۔ الاٹمنٹ والوں سے مایوس ہو کر علن نے اپنے طور پہ دوکان حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ دوکان نہ ملنی تھی نہ ملی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ بساط خانے کا سامان گاڑی پہ رکھ کے بیچا جائے۔ اس کے پاس رکھا کیا تھا جو یہ سامان خریدتا قلاش اور بے سہارا مہاجروں کے لیے اس زمانے میں ایک ہی بیوپار کھلا ہوا تھا اور وہ تھا کبابوں کا بیوپار۔ لاہور میں مویشی دھڑا دھڑ ذبح ہو رہے تھے۔ جس کسی کو کوئی صورت نظر نہ آئی۔ اس نے بڑے کا تھوڑا سا گوشت خریدا' فٹ پاتھ پہ چولہا گرم کیا اور کباب بنانے شروع کر دیئے۔ علن جب ہر طرف سے مایوس ہوا تو وہ بھی آخر اسی طرف متوجہ ہوا۔ لنڈا بازار سے چھ سات سیخیں خریدیں۔ ایک دوکاندار

اسے اس کے پتھر پہ بیٹھنے کا معاہدہ کیا اور مزے سے کباب بیچنے شروع کر دیئے۔ یہی پتھر بال آخر علن' رفیا اور کالے خاں کی ٹھیک بن گیا مگر اس ٹھیک کو وہ حیثیت حاصل نہ ہو سکی جو حسن پور کی دوکان کو حاصل تھی۔ اب وہ لوگ کہاں تھے۔ جن کی علن کی دوکان پہ بیٹھک جما کرتی تھی اور جہاں بیٹھ کر رفیا کا تخیل بے لگام ہو جاتا تھا اور کالے خاں کی مونچھیں تن جاتی تھیں۔ اور علن کا پلیوں خون بڑھتا تھا۔ سامنے سڑک پر بے سروسامان پریشاں حال مہاجروں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نظر آتیں اور گزر جاتیں۔ ہر قماش کا آدمی چلتا دکھائی دیتا۔ ہر رنگ کی صورت نظر آتی اور رفیا' علن اور کالے خاں چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ ان کی وہ فقرہ بازیاں' وہ قہقہے' وہ گپ بازیاں یوں ختم ہوئی تھیں۔ گویا وہ ان سے کبھی آشنا ہی نہ تھے۔ دراصل تینوں ہی اب کچھ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔ کالے خاں نے پشاور رجمنٹ کے واقعات سنانے چھوڑ دیئے تھے۔ اب اسے بہت دنوں سے یہ بتانے کی بھی ضرورت پیش آئی تھی کہ وہ واقعی پٹھان ہے۔ خیر کالے خاں یوں بھی ایسا باتونی نہیں تھا۔ تعجب تو رفیا پہ ہے جس کی زبان کبھی تالو سے لگتی ہی نہیں تھی اور جو ایک ایک اشارے سے ایک ایک داستان تیار کرتا تھا آخر اسے کیا ہو گیا تھا۔ اس کے تخیل کی اڑان کہاں چلی گئی تھی۔ اب تو وہ یوں خاموش بیٹھا رہتا تھا گویا اس کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ دلی کا تذکرہ بھی ختم تھا اور اخبار کی خبریں بھی معرض بحث میں نہیں آتی تھیں۔ سپو میاں کا ذکر ہوتا لیکن بس ضرورت کے مطابق۔ علن' رفیا' کالے خاں تینوں گم متھان بنے بیٹھے رہتے۔ علن خاموشی سے کباب سینکتا رہتا۔ کوئی گاہک آ کر کباب مانگتا۔ علن چپ چاپ سیخوں سے طشتری میں کباب اتارتا' ان پر پیاز چھڑکتا' چٹنی ڈالتا اور گاہک کے حوالے کرتا۔ گاہک کباب کھا کر پیسے ادا کرتا اور آگے بڑھ جاتا اور علن پھر اونگھنے لگتا۔ اس کے چہرے پہ ایک ایسی افسردگی اور اضمحلال نظر آتا تھا جو اس سے پہلے کبھی اس کے چہرے پہ نہیں دیکھا گیا تھا۔ افسردگی خالے خاں کے چہرے پہ بھی نظر آتی تھی۔ لیکن اس افسردگی میں ایک اضطراب ایک بے چینی کی کیفیت بھی ملی نظر آتی تھی۔ اسے دیکھ کر اکثر یہ شبہ گزرتا کہ اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے اور وہ اسے ڈھونڈھ لینے کے لیے بیتاب ہے۔ علن کے برابر وہ گم سم بیٹھا رہتا سڑک پہ چلتی ہوئی بھیڑ سے بے غرض' کبابوں کی خوشبو سے بے نیاز۔ اور وہ یکا یک چونک اٹھا۔ ''ابے علن۔''

علن لاپروائی سے ''ہوں'' کہتا اور آگ کو پنکھا کرنے لگتا۔

کالے خاں پوچھتا۔ ''یار کیا... شیر وچ مچ مر گیا؟''

رفیا ان الفاظ پہ اچانک چونکتا۔ پہلے وہ کالے خاں کو دیکھتا۔ پھر اس کی سوالیہ نگاہیں علن کے چہرے پہ جم جاتیں۔

علن کا ہاتھ ڈھیلا پڑ جاتا۔ لیکن وہ آگ کو بدستور پنکھا کیے جاتا۔ وہ تھوڑی دیر خاموش رہتا اور پھر آہستہ سے بڑے افسردگی

آمیز لہجہ میں جواب دیتا۔ ''ہاں مر ہی گیا۔''

پھر خاموشی چھا جاتی۔ علن انگاروں کو تیزی سے پنکھا کرنے لگتا۔ رفیا کا سر جھک جاتا کالے خاں ٹکٹکی باندھ کر خلا میں گھورنے لگتا۔

کالے خاں اس قسم کے بے تکے سوال اکثر کرتا اور خود بخود مطمئن ہو جاتا۔ علن کی دوکان پر وہ بیٹھا رہتا۔ بیٹھا رہتا اور پھر ایک ساتھ وہاں سے اٹھتا اور جدھر منہ اٹھتا چل پڑتا۔ جب دور کسی سنسان سڑک پہ نکل جاتا تو اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ آخر وہ کس مقصد سے ادھر آیا ہے۔ وہ پلٹتا اور پھر علن کی دوکان پہ خاموش جا بیٹھتا۔ اس کی سمجھ میں اب اپنی اکثر باتیں نہیں آتی تھیں اور اب باتیں بھی کچھ اس قسم کی کرنے لگا تھا جو اس نے پہلے کبھی نہیں کی تھیں۔ حسن پور میں وہ کبھی سبطین کے پاس جا کر نہیں بیٹھا۔ حالانکہ سبطین کو اس وقت بھی عام لوگوں سے ناطہ قائم کرنے اور انہیں اپنی تحریک کے زیر اثر لانے کی دھن تھی۔ لیکن اب وہ سبطین کے پاس جا جا کر بیٹھا اور گھنٹوں اس کی باتیں سنیں۔ اس نے بڑے خلوص اور دیانتداری سے سبطین کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مگر وہ کچھ نہ سمجھا۔ مزمل نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی کہ کالے خاں بھڑکنے نہ پائے۔ اسے قطعی امید تھی کہ وہ تحریک کا بڑا مفید اور سرگرم بلکہ سرفروش رکن بن سکتا ہے۔ مگر کالے خاں کو رفتہ رفتہ وہاں بیٹھنے سے خفقان ہونے لگا۔ آخر وہ رستہ تڑا کر بھاگ ہی نکلا۔ ایک مرتبہ نکلنے کے بعد دوبارہ اس نے مزمل کی بات پہ کان نہیں دھرا اور پھر کبھی اس طرف کا رخ نہیں کیا۔ مگر سکون اسے علن کی دوکان پہ بھی حاصل نہ ہوا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ آخر پہلے علن اور رفیا کی صحبت اس کے لیے کیوں آسودگی کا سامان مہیا کرتی تھی اور اب کیوں اسے اس دوکان سے وحشت ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ آخر اس آشفتہ سری' اس اضطراب کا اصل سبب کیا ہے اور اس کا سد باب کیونکر ہو سکتا ہے یہ اضطراب محض باطنی نہیں تھا۔ اس نے اپنے ظاہری اطوار میں بھی اک تبدیلی محسوس کی تھی اور تو اور اس کا ذائقہ تک بدلا جا رہا تھا۔ جس لطف سے وہ علن کی باسی گڑ دھانیاں کھایا کرتا تھا اور چنوں کی پھنکیاں مارا کرتا تھا۔ اس لطف سے وہ اس کے بنائے ہوئے کباب کبھی نہ کھا سکا۔ ایک مرتبہ تو اس نے علن سے کہہ بھی دیا۔ ''یار یہ تیرے کباب تو بالکل سیٹھے سیٹھے ہووے ہیں۔''

علن نے جواب دیا۔ ''تو پیارے چٹنی ملا لیا کر۔''

اس پہ کالے خاں نے کہا۔ ''یار تیری چٹنی بھی گھاس ہووے ہے۔''

علن کھسیا کر بولا۔ ''تو بھیا تو اپنے منہ کا علاج کرا۔''

ایک منہ پر منحصر نہیں۔ اس کے سارے جسم کا یہی حال تھا۔ آخر وہ علاج کیسے کراتا اور کیا کراتا۔ اس کا پورا جسم ٹوٹتا ہوا سا معلوم

ہوتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ اسے کسی سخت سی چیز سے ٹکرائے کبھی کبھی اس میں یہ خواہش شدت سے جاگ اٹھتی کہ وہ کسی طوفان خیز سمندر کی بلند ہوتی ہوئی موجوں میں چھلانگ لگا دے اور پوری قوت سے ان سے لڑے۔ کبھی وہ اس پہ مائل ہوتا کہ بھڑکتی ہوئی آگ میں کود پڑے اور یا تو اس میں خود جل کر بھسم ہو جائے یا اپنے زور سے اس آگ کو بجھا دے اسے اکثر حسن پور کے آخری دن بھی یاد آتے تھے اور اس یاد کے ساتھ وہ انگاروں پہ لوٹنے لگتا۔ ایسے موقعوں پر اسے حق صاحب اور نمبردار صاحب پر بہت غصہ آیا ہے۔ وہ اکثر ان کے ناموں کے ساتھ گلیوں کے اسما صفت استعمال کر کے یہ شکایت کرتا تھا کہ انہوں نے مقابلہ نہیں ہونے دیا اور وقت سے پہلے بھاگ چھٹے۔ اب اس ایک غلطی کی تلافی کیسے کی جائے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی اور اس کا خون اندر ہی اندر کھول کر رہ جاتا تھا۔ سبطین کو وہ حق صاحب اور نمبردار صاحب کی صف میں تو شمار نہیں کرتا تھا۔ لیکن اس سے بھی وہ کچھ ایسا خوش نہیں تھا۔ ایک مرتبہ اس نے رفیا سے کہہ ہی دیا۔ ''ابے رفیا یہ تیرے سپومیاں جو ہیں یہ بس یونہی ہیں۔''

رفیا اس بات پہ بہت تپا۔ ''بات کیا ہے بے؟''

''بات کچھ بھی نہیں۔'' کالے خاں بولا۔ ''جنیں کیا آلھا اور دل گاوے ہیں۔ میرے پلے تو کچھ پڑتا نئیں۔''

رفیا بولا۔ ''یار تو ون کی بات کیا سمجھے گا۔ پڑھوں لکھوں کی بات ہے وے اور تو ہے لٹھ۔''

''نہیں بے۔'' کالے خاں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''وے تو بالکل تیری طریوں گپ بازی کریں ہیں۔''

رفیا اس فقرے پہ بہت سرد ہوا۔ کالے خاں نے اسے جواب کا موقعہ نہیں دیا۔ کہنے لگا۔ ''یار میں تو بہ کنوں ہوں کہ بس دھت تیری کی اور دھت تیری کی لگے رگڑا اور مٹے جھگڑا۔''

رفیا نے بھن کر کہا۔ ''تو پیارے کشمیر چلا جا۔ واں خوب بج رئی اے۔ تیرے دل کے سارے ارمان نکل جاویں گے۔''

کالے خاں یہ فقرہ سن کر دم بخود رہ گیا۔ علن نے سیخ پہ قیمہ چڑھانا شروع کر دیا اور رفیا آگ جھلنے لگا۔

کالے خاں تھوڑی دیر بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ پھر ایکا ایکی بہت آہستہ سے وہ وہاں سے اٹھا اور ایک طرف کو ہو لیا۔

رات کو جب رفیا اور علن اپنی کوٹھری میں پہنچے تو اس کے تقریباً دو گھنٹے بعد کالے خاں گھر لوٹا۔ رات اس کی خاصی بے چینی سے گزری۔ رفیا تو خیر بے خبر سوتا تھا۔ لیکن علن کی جب آنکھ کھلی اس نے کالے خاں کو کروٹیں بدلتے پایا۔ ایک مرتبہ اس نے ٹوکا بھی۔

''بے کالے خاں کیا بات ہے؟''

کالے خاں نے جواب دیا۔ ''بیچ نیند نئیں آتی۔'' اور یہ کہہ کے دوسری طرف کروٹ لے لی۔

صبح کو کالے خاں نے اعلان کیا کہ ''یار میں پنڈی جا رہا ہوں۔''

رفیا اور علن دونوں خاموشی سے اسے دیکھنے لگے۔ علن نے پوچھا۔ ''کیوں؟''

''واں سے کشمیر جاؤں گا۔''

رفیا اور علن دونوں کی نگاہیں اس کے چہرے پہ جم گئیں۔

آخر رفیا بولا۔ ''پر سبو میاں یوں کہہ رہے تھے کہ کشمیر میں لڑائی بند ہو رئی اے۔''

کالے خاں نے فوراً جواب دیا۔ ''یار میں جھوٹ نئیں کہتا۔ یہ تیرے سبو میاں بیٹھے بیٹھے بس گپ بازی کیا کریں ہیں اور دن سے کچھ نئیں آتا۔''

اور یہ کہہ کے اس نے اپنا بستر لپیٹنا شروع کر دیا۔

گلی خاموش ہے۔ کہیں دور سے ایک کتے کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ رات گہری ہو چلی ہے۔ اس وقت بارہ کا عمل ہوگا۔ اپنے پاس گھڑی تو ہے نہیں۔ جب گھڑی پاس نہ ہو تو پھر فضا کے سناٹے اور کتوں کی آوازوں سے ہی وقت کا اندازہ لگانا پڑتا ہے۔

آج میں نے اپنی ڈائری عجب انداز میں شروع کی ہے۔ دن کے سارے ہنگاموں اور سرگرمیوں کو چھوڑ کر میں رات کا ذکر لے بیٹھا ہوں اور رات کے بھی وہ لمحے جنہیں ۳۱ دسمبر کے آخری سانس کہنا چاہیے۔ خیر یہ بات عجیب سہی غلط تو نہیں ہے۔ رات کے سناٹے سے بڑا ہنگامہ میرے تصور میں نہیں آتا۔ رہیں دن کی سرگرمیاں سو یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ آدمی چراغ لے کر ہوا سے لڑنے نکلے' دن کیا' دن کے ہنگامے کیا۔ ہر سرگرمی کی تان جمود ہی پر ٹوٹتی ہے۔ سارے ہنگامے خاموش ہو جاتے ہیں۔ بس ایک خاموشی کا ہنگامہ کبھی خاموش نہیں ہوتا۔

دن کے بارے میں کیا لکھوں۔ آج دن میں کوئی ایسی بات ہوئی ہی نہیں۔ جس کا تذکرہ کیا جائے۔ آج کا دن تو تاریخی نہ تھا۔ لیکن آج کی رات ضرور تاریخی ہے۔ ۴۸ء نے لوٹ پیٹ کر اپنی زندگی کے دن پورے کر ہی لیے اس کے پیٹ سے ایک ادھ مرا بچہ پیدا ہوا ہے۔ ۴۹ء! فضا کی نبض ڈوبتی جاتی ہے۔ رات خاموش ہے۔ کشمیر کے محاذ پر بھی اب خاموشی چھا گئی ہوگی۔ جو مجاہدین سر پہ کفنیاں باندھ باندھ کر میدان میں پہنچے تھے۔ انہوں نے اب تلواریں نیاموں میں ڈال لی ہوں گی اور چپ چاپ اپنے خیموں کو واپس آ رہے ہونگے میں سوچتا ہوں کہ اس وقت ان پر کیا کیفیت گزر رہی ہوگی۔ جنگ کے خاتمہ پر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا ہوگا یا انہوں نے ایک کرب محسوس کیا ہوگا۔ مگر یہ تو جزوی بات ہوئی اصل بات یہ ہے کہ لڑائی ختم ہوگئی۔ رات خاموش ہے۔ فضا کی نبض

ڈوبتی جاتی ہے۔ دور سے کسی اکیلے کتے کے رونے کی آواز برابر آئے چلی جارہی ہے۔ ہم لوگوں سے تو یہ کتا ہی زیادہ حساس نکلا۔ کتے آدمی کی نسبت یوں بھی زیادہ حساس ہوتے ہیں اور آدمی بے حس ہو جائے تو پھر وہ اور زیادہ حساس ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ دن کی روشنی میں ان سے زیادہ بے حس اور ذلیل مخلوق کوئی نظر نہیں آتی۔ ان کے جگر کی ساری تپش ان کے دل کا سارا درد کالی راتوں کے سناٹے میں پوری شدت کے ساتھ اپنا اظہار کرتا ہے۔ آخر وہ راتوں کو کیوں اتنے درد سے روتے ہیں اور وہ کونسی شے ہے جو ان کے نالوں میں اتنا سوز' اتنا کرب پیدا کر دیتی ہے۔ یہ سوال واقعی غور کرنے کا ہے مگر مجھے نیند آ رہی ہے۔ کیا دماغ اور کیا آنکھیں انسان کے سارے حواس رات کے جادو کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں۔ میری آنکھیں بند ہوتی جارہی ہیں۔ اب مجھے سو جانا چاہیے۔

فیاض خاں نے ڈائری بند کر کے تکیہ کے نیچے رکھ لی اور چپکے سے لحاف میں دبک گیا آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ لیکن جب اس کی کنپٹی پہ کھجلی ہوئی تو صرف اس کے ہاتھ نے ہی جنبش نہیں کی۔ بلکہ اور دوسرے اعضا بھی بیدار ہو گئے۔ اس نے آہستہ سے کروٹ لی اور سکڑی ہوئی ٹانگوں کو پھیلایا۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں۔ بلکہ اس مرتبہ تو اسے جھپکی بھی آ گئی تھی۔ لیکن کسی نامعلوم کھٹکے سے اس کی آنکھ پٹ سے کھل گئی اس نے فوراً ہی پھر آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ مگر ذہن بھی عجب بے قابو شے ہے ایسی آہستگی سے آنکھ بچا کر نکلتا ہے کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی اور ان بھولے بسرے رستوں پہ چل پڑتا ہے جنہیں حافظہ ہزاروں من مٹی کے نیچے دفن کر چکا ہوتا ہے۔ جانے اسے ان دو پٹھانوں کا خیال کیسے آیا جنہیں اس نے کاندھے پہ بندوق رکھے مال روڈ پہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے دیکھا تھا اور جو کشمیر جانے کے لیے سرگرداں پھر رہے تھے اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ان پٹھانوں کی تقریب سے اسے کالے خاں کا خیال آیا۔ ان پٹھانوں اور کالے خاں میں بس ایسا ہی رشتہ تھا جیسا چوراہے کی اینٹ اور ترازو کے بانٹ میں ہوتا ہے۔ لیکن تصور پہ کسی کا کیا بس ہے۔ فیاض خاں کو کالے خاں کا خیال آیا اور اسی تقریب سے آیا۔ کالے خاں کا خیال آتے ہی وہ بے ساختہ مسکرا پڑا۔ عجب بہنگم شخص ہے۔ سمجھتا ہے کہ نام کے ساتھ خان لگانے سے وہ واقعی پٹھان بن جائے گا۔ بھلا نام میں کیا رکھا ہے۔ پٹھانی نام کا نہیں مزاج کا نام ہے۔ اب میرا ہی نام ہے اس میں سے میں خان کا لفظ اڑا دوں تو فرق کیا پڑتا ہے اس خیال کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے نام کے آگے سے خان کا لفظ واقعی اڑا دیا اور خالی ''فیاض'' کا تصور کرنا چاہا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ ایک مرغا ہے۔ جس کا کیس یکا یک غائب ہو گیا ہے وہ سوچنے لگا کہ ''خان'' مرغ کا کیس ہوتا ہے۔ کیس اڑا دیجئے۔ مرغا غائب گنجارہ جاتا۔ کیس مرغوں کی نسلی علامت ہے' قومی نشان' ہے۔ اس کا خیال بھٹک کر

کسی دوسری طرف جا نکلا۔ حد نگاہ تک اونچی نیچی پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ مرغوں کا ایک غول ان چوٹیوں پر حرکت کرتا نظر آ رہا تھا ان کے کیس غائب تھے اور وہ سرنیوڑہائے آنکھیں بند کئے چپ چاپ ڈھلوانوں پر اترتے چلے جا رہے تھے۔ فیاض خاں نے جسم پہ سے کمبل الٹ دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ اسے سردی لگنے لگی اور وہ ایک ساتھ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بوٹ کے تسمے باندھے اپنا موٹا کوٹ پہنا اور صحن میں نکل آیا۔ ستارے کچھ مند گئے تھے' مندر ہے تھے ایک بڑے رقبہ میں دھندلے ستاروں کے ادغام سے کچھ ایسی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ گویا کسی قافلہ نے یہاں چولہے روشن کئے تھے۔ وہ قافلہ گزر گیا ہے اور وہ چولہے اب بجھے پڑے ہیں۔ بعض بڑے بڑے ستارے کچھ یوں بے نور ہو گئے تھے۔ گویا روشن آنکھیں یکا یک پتھرا گئی ہوں۔ البتہ صبح کا ستارہ اب تک جگر جگر چمک رہا تھا۔ دور افق پر اندھیرا اور اجالا مل کر کچھ سازش کر رہے تھے۔ فیاض خاں صحن سے نکل کر سڑک پر آ گیا اور آگے چل پڑا۔ سڑک خاموش تھی۔ اس خاموش ماحول میں اسے صرف دو آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اپنے بھاری بوٹوں کی آواز اور اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز۔ اس نے اور تیزی سے چلنا شروع کر دیا۔ مختلف موڑوں سے گزرنے کے بعد وہ ایک طول طویل سڑک پہ ہو لیا۔ نہر کے پل پر پہنچ کر وہ ٹھٹھکا۔ وہ پھر نہر کی سڑک پہ پڑ لیا رات کی تاریکی ڈھل چکی تھی۔ فضا میں ہر طرف ایک لطیف قسم کا سفید دھند چھایا ہوا تھا۔ نہر کے پانی پر دور تک سفید غبار منڈلاتا نظر آ رہا تھا۔ فیاض خاں کو پہلے تو یہ نظارہ بھلا لگا۔ مگر پھر اس کی یکسانیت سے اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ وہ سوچنے لگا کہ آخر یہ نہر ہر جگہ ایک سی کیوں ہے۔ اس میں نشیب و فراز اور پیچ و خم کیوں نہیں ہیں اور کناروں پر ہر چند قدم کے بعد ایک درخت کیوں آتا ہے۔ کیا یہ درخت قدم ناپ کر لگائے گئے ہیں۔ فطرت کا وحشیانہ پن آخر کہاں گیا۔ آخر ایسا کیوں نہیں ہے کہ پھولوں کے درخت جہاں ہوں وہاں اکھٹے ہوں اور اتنے ہوں کہ پھولوں کی ڈالیوں کے بوجھ سے پانی کا دم رکنے لگے۔ اس خیال کے ساتھ ساتھ اس کے قدم سڑک کی دوسری سمت میں مڑنے لگے۔ سڑک سے نیچے دور تک سبزہ پھیلا ہوا تھا اور اس سبزے پر کہرے کی ہلکی دودھیا چادر بچھی ہوئی تھی۔ سڑک سے اتر کر وہ اس سبزے پہ چلنے لگا۔ گھاس کے ایک شاداب ٹکڑے پر پہنچ کر وہ رکا۔ اس نے بیٹھ کر بوٹ کے تسمے کھولے اور ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پہ پاؤں رکھ دیئے اس نرم اور ٹھنڈی گھاس کے لمس میں اسے کچھ اس قدر لطف آیا کہ اس کا بے تحاشا یہ جی چاہا کہ پورے جسم سے اس لمس کو محسوس کیا جائے وہ زمین پہ پٹ لیٹ گیا اور اپنا منہ شبنم آلود گھاس پہ رکھ دیا۔ کئی منٹ تک وہ چپ چاپ لیٹا رہا اور رفتہ رفتہ اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کے سینے کے ساتھ ساتھ اس کے سینے کے نیچے والی زمین کا سینہ بھی دھڑک رہا ہے اس نے آسمان پہ بے کیفی اور بے حسی کی جو کیفیت دیکھی تھی۔ اس سے یہ کیفیت بالکل مختلف تھی۔ گھاس برف کی طرح ٹھنڈی تھی۔ مگر اس نرم اور سرد گھاس کے نیچے اس نے حرارت اور حرکت کو

محسوس کیا۔ یہ تجربہ اس کے لیے نیا بھی تھا اور تسلی بخش بھی۔ اس نے اب تک زمین کو اپنے قدموں سے روندا تھا۔ اس کی نرمی اور حلاوت کو محسوس نہیں کیا تھا اسے یوں لگا کہ ایک لطیف سے سرد لباس میں ملبوس کوئی نرم گرم چیز اسے اپنی آغوش میں لئے لے رہی ہے اور وہ اس میں گم ہوا جا رہا ہے۔ اس پر ایک شیریں غشی سی چھائی جا رہی ہے۔ یکا یک ایک خفیف سے کھٹکے سے اس کا دھیان بٹ گیا۔ وہ بہت چونکا تو نہیں مگر آہستہ سے آنکھیں ضرور کھول دیں۔ سورج نکل آیا تھا۔ نرم سنہری شعاعیں گھاس کے گدگدیاں کر رہی تھیں۔ تھوڑے سے فاصلہ پر کوڑے کے ڈھیر پر جنگلی کبوتروں کا ایک غول اتر آیا تھا اور بڑی سرگرمی سے اس میں سے دانے چگ رہا تھا۔ دانہ چگتے چگتے ان کے سراپا حرکت جسم بار بار اتنے قریب آ جاتے کہ بس یوں لگتا کہ زمین پہ کسی نے بہت سا سرمہ بکھیر دیا ہے اور اس میں برقی لہریں پیدا ہو گئی ہیں۔ پاس ہی کوؤں کی بھی ایک ٹولی مٹر گشتیاں کرتی پھرتی تھی۔ کبوتروں کا غول آپ ہی آپ بھرا کھا کے اڑ گیا۔ کوؤں کے دل میں نہ جانے کیا سمائی کہ وہ بھی وہاں سے اڑ لئے۔ ایک کوے کا بازو لٹک گیا تھا اس نے پہلے تو اڑانے کی کوشش کی۔ مگر جب وہ اس کوشش میں ناکام رہا تو بہت دور تک گھاس پہ دوڑتا چلا گیا۔ مگر کوے دور نکل گئے تھے اور وہ تھک کر پھر رینگنے لگا۔ فیاض خاں بہت دیر تک اس اپاہج کوے کو دیکھتا رہا اور رفتہ رفتہ اسے یوں محسوس ہوا کہ خود اس کا بازو بھی لٹک گیا ہے۔ کسی غلیچی کے غلہ نے اس کا بازو توڑ کر رکھ دیا ہے اور کوؤں کی باقی برادری سے اس کا ناطہ ٹوٹ چکا ہے۔ اس وقت پہلی بار اس کے دل میں خیال آیا کہ اس نے اپنی زندگی بلاوجہ ضائع کی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج کی درشتی اور شدت سرد پڑ گئی اس کی جگہ ایک افسردہ سی کیفیت نے لے لی۔ افسردگی کے ساتھ ساتھ اس خیال نے اور زور پکڑا۔ اس کے جسم کے کسی نامعلوم کونے سے ایک آواز آ رہی تھی۔ ''زندگی ضائع ہو گئی۔ زندگی ضائع ہو گئی۔'' پہلے اس نے اس آواز کا گلا دبانے کی کوشش کی۔ اس پر غلبہ پانا چاہا۔ لیکن اس آواز کا زور بڑھتا گیا۔ اور وہ پسپا ہو کر مضمحل ہونے لگا۔ عین اسی عالم میں اسے افسری کا خیال آیا۔ وہ پکا ہوا پھل جو اس کی گودی میں آ گرا تھا اور جسے اس نے ٹھکرا دیا تھا۔ کاش وہ وقت پھر واپس آئے اور ایک مرتبہ پھر..... مگر اس خواہش کا گلا اسی آواز نے گھوٹ دیا۔ جو اس کے جسم کے نامعلوم کونے سے بلند ہو رہی تھی اور جو کہہ رہی تھی۔ ''زندگی ضائع ہو گئی۔ وقت بیت گیا۔'' اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دھیان بٹانے کی خاطر ایک مرتبہ پھر اس کیفیت کو محسوس کرنا چاہا جس کا وہ تھوڑی دیر پہلے تجربہ کر چکا تھا مگر وہ دھڑکتی ہوئی آغوش جو تھوڑی دیر پہلے اسے بھینچ لینے کے لیے بے تاب تھی۔ اب سمٹ گئی تھی۔ زمین کی وہ سوندھی سوندھی خوشبو وہ نرمی وہ حلاوت غائب ہو چکی تھی۔ ٹھنڈی گھاس پہ لیٹے لیٹے اسے جاڑا لگنے لگا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے پیروں میں بوٹ ڈالے ان کے تسمے باندھے اور اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔

وہ بہت دیر تک بے مقصد' بے مطلب گھومتا رہا۔ مگر اب اس کی چال میں وہ تندی' وہ زور شور باقی نہیں تھا۔ کئی مرتبہ اسے اپنی سست روی پر جھلاہٹ ہوئی اور اس نے نیت باندھ کر تیز رفتاری سے چلنا چاہا۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ تیز نہ چل سکا۔ اس کی چال میں ایک اضمحلال کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ دیر تک وہ مختلف سڑکوں کے چکر کاٹتا رہا۔ سنسان سڑکوں سے گزر کر وہ آباد گلیوں میں پہنچ گیا۔ چلتے چلتے اس نے اچانک اپنے آپ کو حق صاحب کے مکان کے سامنے کھڑا پایا۔ وہ اپنی اس غیر شعوری حرکت پہ حیران بھی ہوا۔ اور اسے غصہ بھی آیا۔ اس نے وہاں سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کی۔ لیکن دو قدم چل کر اس کے پاؤں پھر رک گئے۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ کسی نے اس کے قدم پکڑ لیے ہیں۔ سامنے دریچے میں ایک سایہ سا نظر آیا اور اوجھل ہو گیا۔ وہ صورت اچھی طرح نہیں دیکھ سکا تھا۔ مگر اسے یہ یقین ہو گیا کہ وہ افسری تھی اور اس خیال کے ساتھ ساتھ اس کا دل دھڑکنے لگا کہ کہیں اس نے اس حال میں اسے دیکھ تو نہیں لیا ہے۔ محض خفت مٹانے کی غرض سے اس نے جلدی سے بڑھ کر دروازے پہ دستک دے دی۔ تھوڑی دیر میں نوکرانی نکل کر آئی اور پوچھنے لگی۔ ''کون ہے جی؟''

فیاض خاں نے مختصر سا جواب دیا۔ کہو کہ فیاض خاں آیا ہے۔''

تو نوکرانی اندر گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ''وکیل صاب گھر پہ نئیں ہیں۔ بیگم صاب کہتی ہیں کہ جب وہ آئیں گے تو آپ کا نام بتا دیں گے۔''

فیاض خاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ کسی نے یکا یک اس کے جسم کی روح سلب کر لی تھی۔ کئی منٹ تک وہ بالکل گم سم کھڑا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور وہاں سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اخبار بند ہو جانے کے بعد سبطین پر کئی دن تک بے حسی کی کیفیت طاری رہی اس پہ نہ تو غم کا ایسا دورہ پڑا جو حسن پور میں ''انقلاب'' کے بند ہونے پر پڑا تھا اور نہ اس نے غصہ کی ضرورت محسوس کی۔ اسے بس یوں معلوم ہوا کہ کوئی چیز کھو گئی ہے۔ ٹوٹ گئی ہے۔ جس کا دوبارہ حاصل ہونا مشکل ہے۔ ملال اور افسردگی کی اک گہری کیفیت نے اسے آدبوچا۔ اس کیفیت نے چند دنوں کے لیے اس کی سوچ کو بھی معطل کر دیا۔ اس نے کئی مرتبہ اس حادثے پر واضح طور پر سوچنے کی کوشش کی۔ مگر ہر مرتبہ اس کی آنکھوں میں ترمرے ناچنے لگے اور ذہن میں خاک سی بھر گئی۔ چیزوں کا وجود اس کی نظروں میں دھندلا گیا تھا اور اسے مبہم طور پر یوں محسوس ہوتا تھا کہ دنیا خالی ہو گئی ہے۔ ایک خلا کا احساس تھا جو اس کے عقل و ہوش پر چھا گیا تھا۔ شاید اس کی دنیا میں اب دن اور رات بھی باقی نہیں رہے تھے۔ وہ دن میں کسی وقت بھی چادر تان کر لیٹ جاتا اور سنانے لگتا۔ وہ سوتا رہتا' سوتا رہتا۔ یہاں تک کہ رات ہو جاتی۔

پھر کسی وقت رات گئے۔ وہ اٹھ بیٹھتا اور صحن میں ٹہلتا اور سارے وہ کام کرتا جو دن سے مخصوص ہیں۔ مزمل اجمل اور فیاض خاں کو دیکھ کر کبھی کبھی گمان گزرتا کہ یہ اجنبی لوگ ہیں اور اس سے ملنے آئے ہیں۔

پھر رفتہ رفتہ یہ بے حسی کی کیفیت ختم ہوئی۔ اس کے ذہن کی دھندلاہٹ مٹنے لگی۔ اور چیزوں کی شکلیں اس کی نگاہ میں واضح ہوتی گئیں۔ بے حسی اور ابہام کی جب یہ کیفیت ختم ہو چکی تو سوچ بچار کی وہ پرانی عادت پھر عود کر آئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر شدت سے سوچنا شروع کیا کہ اخبار کا بند ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے اور اس کے دوبارہ اجرا کی کیا صورت ہو سکتی ہے وہ ساری سکیم مرتب کر لیتا اور ساری چولیں بٹھاتا چلا جاتا۔ مگر آخر میں سوال پیسے کا اٹھ کھڑا ہوتا اور ساری عمارت نیچے آ گرتی۔ وہ پیسے کا مسئلہ کبھی حل نہ کر سکا۔ اس کے لیے اس نے حق صاحب اور نمبردار صحب پہ تکیہ کیا تھا اور یہ دونوں بزرگ باتوں سے سونے کے محل کھڑے کرتے تھے اور عمل کے موقعہ پر صاف کنی کاٹ جاتے تھے۔ سبطین چونکہ باتوں کا بادشاہ تھا۔ اس لیے وہ ان ہوائی قلعوں کو ٹھوس حقائق کے برابر بلکہ ان سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ مگر اب اس آخری شکست نے ان ہوائی قلعوں کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔ سبطین کو اب یہ جرات نہیں پڑتی تھی کہ پیسے کے سوال کو بالائے طاق رکھ کر کوئی منصوبہ بنائے۔ اس نے اس مسئلہ پر بھی بہت سوچ بچار کیا کہ آخر قوم اسے چندہ کیوں نہیں دیتی۔ اس سوال پر سوچتے ہوئے اسے اپنی ذات پر بھی بار بار شک گزرا۔ اسے پہلے تو اپنے خلوص پر شبہ ہوا۔ اسے یقین تھا کہ مسلمان عوام کی جبلت ہمیشہ راستی پر ہوتی ہے۔ وہ جب کسی کو سر آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں۔ تب بھی راستی پر ہوتے ہیں اور جب کسی کے گلے میں لعنت کا طوق ڈالتے ہیں۔ تب بھی راستی پر ہوتے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک رہنما خلوص قلب اور نیک نیت کے ساتھ ان کے پاس جائے اور وہ اس کی راہ میں آنکھیں نہ بچھائیں۔ مگر جب اس نے خلوص کو چندے کے سوال سے متعلق کر کے سوچنا شروع کیا تو اسے اپنے عقیدت کی عمارت بیٹھتی نظر آنے لگی۔ کیا وہ سارے رہنما جو ہر تقریر پہ اپنا دامن بھر لیتے ہیں پر خلوص ہوتے ہیں۔ کیا قوم جنہیں چندہ دیتی ہے۔ وہ ہمیشہ اس جا جائز خرچ کرتے ہیں۔ فیاض خاں ہوتا تو یہ کہتا کہ یہ سب احمق سازی کا کھیل ہے۔ قوم اپنے رہنماؤں کو احمق بنانا چاہتی ہے اور رہنما اپنی قوم کو احمق بنانا چاہتے ہیں۔ دونوں میں سے جس کا بس چل جاتا ہے۔ سینے پہ چڑھ بیٹھتا ہے۔ مگر سبطین ایسی بیڈھب توجیہات کا قائل نہیں تھا اس نے اس پورے سوال کو گورکھ دھندا سمجھ کر چھوڑ دیا اور پھر دوسرے ہی پہلو سے مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا۔

اخبار کے دوبارہ اجرا کی جب صورت نظر نہ آئی تو پھر سبطین نے تحریک کو دوسرے طریقوں سے چلانے کے امکانات پر غور شروع کیا۔ کئی تجویزیں اس کے ذہن میں آئیں اور انہیں اس نے رد کر دیا۔ ایک یہ تجویز بھی اس کے ذہن میں آئی کہ گاؤں گاؤں

گھوم کر تقریریں کی جائیں اور لوگوں تک اپنی بات پہنچائی جائے مگر پھر اس نے سوچا کہ خالی تقریروں سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی ٹھوس کام کرنا چاہیے۔ ٹھوس کام کی تلاش میں اس کا ذہن ایک اور طرف نکل گیا۔ اس نے سوچا کہ ایک درس گاہ قائم کرنی چاہیے۔ ایسی درسگاہ جو ایک مدرسہ فکر بن جائے ایک زبردست قومی ادارے کی شکل اختیار کر لے۔ اس سلسلہ میں اس نے اگلی پچھلی ساری مسلمان درسگاہوں کے نظام کا جائزہ لے ڈالا۔ موجودہ مسلمان درس گاہوں میں کسی کے نظام نے اسے اپیل نہیں کیا۔ کسی کو اس نے مغرب زدہ کہہ کر رد کیا اور کسی کو اس نے دقیانوسی نظام قرار دیا۔ ان درس گاہوں کے متعلق سوچتے سوچتے اس کا ذہن ''شانتی نکتین'' کی طرف رجوع ہو گیا۔ اس کے نظام نے اسے بہت متاثر کیا۔ اسے اس پہ ایک ہی اعتراض تھا کہ اس کی فضا مخصوص طور پر ہندو ذہنیت کی ترجمان ہے۔ اس نے سوچا کہ ایک درس گاہ شانتی نکتین کے طرز پر قائم کرنی چاہیے۔ مگر اس کی فضا کی بو باس اسلامی ہونی چاہیے۔ اس سے سادھو نکلنے چاہئیں۔ بلکہ مجاہدین اور عمل کی تعلیم دینے والے مفکرین پیدا ہونے چاہئیں۔

سبطین نے جب مزمل اور اجمل کے سامنے اپنا منصوبہ پیش کیا تو انہوں نے کچھ ایسی گرمجوشی سے اس کا استقبال نہیں کیا۔ اب تک تو ان کی روش یہی رہی تھی کہ جب سبطین پھریری لیتا تو وہ بھی پھریری لیتے اور جب سبطین افسردہ ہوتا تو وہ بھی افسردہ ہو جاتے۔ مگر اس مرتبہ ان کی افسردگی دیرپا ثابت ہوئی۔ اخبار کے بند ہو جانے نے ان میں ناکامی کا ایسا احساس پیدا کیا تھا جو یوں فرد ہونے والا نہ تھا۔ سبطین جب کبھی نیا منصوبہ پیش کرتا تو اس میں امید کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی تھی اور یہ لہر اس کے اردگرد بیٹھنے والوں میں بھی گرمی پیدا کر دیتی۔ لیکن آج سبطین پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنا منصوبہ بیان کر رہا تھا اور اجمل اور مزمل چپ تھے۔ ان کے چہروں پہ بدستور ایک افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ سبطین اپنا پورا منصوبہ بیان کر چکا۔ وہ بدستور چپ رہے۔ ان کے چہروں پر کسی قسم کی تبدیلی کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔

آخر سبطین نے انہیں ٹوکا۔ ''میاں چپ کیوں ہو۔ کچھ بولو نا۔''

مزمل جماہی لیتے ہوئے بولا۔ ''کیا بولیں؟''

سبطین نے پھر جوش میں آ کر کہا۔ ''اماں بتاؤ نا کہ کیسی سکیم ہے۔''

''بہت اچھی ہے۔'' مزمل نے آہستگی سے جواب دیا۔

اجمل نے ٹکڑا لگایا۔ ''اچھی ہے اور بس۔''

''کیا مطلب؟'' سبطین نے چونک کر اجمل کو دیکھا۔